طیبہ نگہت* ڈاکٹر ارشد محمود آصف

پریم چند کے افسانوں میں مزاحمتی عناصر

Abstract: *This study aspires to have unconventional analysis embodying an expressive style to explore the varying degrees of state repression and tyranny, represented in Prem Chand's short -stories. He was the first Urdu short-story writer who propagated political and social reforms inter-alia against state repression and acts of violence in colonial period. His short-stories feature compendious realism as 'Kafan' is a piece of master-art which laid the foundation of modern Urdu short-story. An uncompressed struggle against the infringement of the rights of people of India and state repression have been ironically criticized in his short-stories.*

اردو افسانے کی تاریخ بیسویں صدی کے آغاز سے شروع ہوتی ہے جو برصغیر میں ریاستی جبر کے عروج کی صدی ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں انگریز سامراج کے عہد میں ریاستی جبر کی جس قدر بھی شکلیں سامنے آئیں ان پر ہمارے افسانہ نگاروں نے طبع آزمائی کی ہے۔ ان میں سے اولین نام پریم چند کا ہے جنہوں نے حب الوطنی کے جذبے کے احیاء کے ساتھ ساتھ جبر کی ہر شکل کے خلاف کہانی کے رمز و ایما میں لکھا ہے۔ ان کی تحریروں میں ریاستی جبر کی نمائندگی ملتی ہے۔ پریم چند کے بعد کے اردو افسانہ نگاروں میں اس ضمن میں ایک لہر چل پڑی اور انہوں نے اپنے افسانوں میں زمینی مسائل، عدم مساوات اور انگریزوں کے مظالم کو موضوعات بنایا۔ مزید یہ کہ جبر کی ہر صورت کو پریم چند سے قبل کے اردو ادبا نے بھی ادبی موضوع بنایا کیونکہ اردو ادب میں ریاستی اور سیاسی جبر کی کہانی اتنی ہی قدیم ہے جتنا خود اردو ادب قدیم ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ سیاسی بیداریوں کے حوالے سے رُونما ہونے والی معاشرتی، سماجی اور عمرانی تبدیلیوں کے ساتھ جبر کے تصورات پختہ ہوئے۔

عشرہ بہ عشرہ بڑھتے ہوئے سیاسی شعور نے جبر اور مزاحمت کے اظہار کو ایک باقاعدہ رجحان کی صورت دے دی خصوصاً بیسویں صدی کے پہلے ربع میں جب برصغیر پاک و ہند میں انگریزی استعمار کے خلاف کانگریس، مسلم لیگ اور دوسری سیاسی جماعتوں یا حلقوں کی طرف سے آزادی کی گفتگو شروع ہوئی تو کمپنی کی حکومت اور اور برطانوی راج کے ظلم و ستم کے خلاف عوام میں بیداری کی ایک لہر دوڑ گئی پہلے یہ شعور عوام کی گفتگو میں ظاہر ہوا پھر آہستہ آہستہ ادب کا حصّہ بننے لگا افسانوں اور ناولوں میں ریاستی جبر کے حوالے سے واقعات کا اظہار سامنے آنے لگا۔ اردو افسانے کے باب میں پہلا نام پریم چند کا ہے جنہوں نے ریاستی جبر کو کہانی کا طاقتور بیانیہ دے کر مظلوم کی دادرسی کی ہے۔ سہراب اسلم رقمطراز ہیں:

*پی ایچ ڈی اسکالر

**اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی، اسلام آباد

"پریم چند کا مجموعہ 'سوزِ وطن' حُب الوطنی سے لبریز تھا اور اس کی روح سامراج دشمنی تھی اس لیے اس کا گرفت میں آنا قدرتی بات تھی۔ پریم چند اس وقت محکمہ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے اور ضلع بھیر پور میں تعینات تھے اس لیے مجموعہ پر "نواب رائے" فرضی نام چھپا ہوا تھا لیکن برطانوی خفیہ پولیس نے اس "نواب رائے" کے پیچھے بیٹھے ہوئے "دھنپت رائے" کا کھوج نکالا جس کے بعد پریم چند کو ضلع کے کلکٹر کے روبرو جواب طلبی کے لیے بلا لیا گیا۔ منشی پریم چند نے کتاب کا مصنّف ہونے کا اقرار کیا۔ ڈپٹی صاحب سیخ پا ہو گئے اور بولے "تمہاری کہانیوں میں سیڈیشن (بغاوت) بھرا ہوا ہے۔ اپنی تقدیر پر خوش ہو کہ انگریزی عملداری میں ہو۔ مغلوں کا راج ہوتا تو تمہارے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالے جاتے۔ تمہاری کہانیاں یک طرفہ ہیں۔ تم نے انگریز سرکار کی توہین کی ہے"۔ (۱)

پریم چند کے بنیادی رجحان کے طور پر سیاسی اور معاشرتی اصلاح ریاستی جبر کی مخالفت اور آزادی ان کا مطمعِ نظر تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ معاشرے میں صالح قدروں کے فروغ اور سیاسی آزادی کے بغیر انسانی خوشحالی کا تصور محض سراب ہے۔ اپنے اصلاحی مقاصد کے لیے انہوں نے اپنے افسانوی ادب میں انہیں مسائل کو موضوع بنایا چنانچہ اُردو کے افسانوی ادب کو ایک قومی مزاج اور تہذیبی کردار عطا کیا۔ اسے ہندوستان کے کروڑوں عوام کے دِل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ بنایا۔ ان کی تصانیف کے ہر ورق سے آزادیِ اظہار، حب الوطنی، انسان دوستی اور ریاستی جبر کی مخالفت کا درس ملتا ہے۔

اگر ہندوستانی سماج میں ان کے افسانوی ادب کے وسیع اثرات کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہو گا کہ انہوں نے اس وسیلے سے نہ صرف یہ کہ عہد کی قدروں کی ترجمانی کی بلکہ نئی اقدار کو جنم دینے کا اعلیٰ فریضہ سرانجام دیا۔ پریم چند اردو افسانے کا باوا آدم ہے جس نے اجتماعی شعور کی نمائندگی اس وقت کی جب ادبا کا رجحان مختصر کہانی کی طرف نہیں تھا۔ پریم چند کا افسانہ "دنیا کا انمول رتن" ریاستی جبر کے تمثیلی اظہار کا نمونہ ہے۔ اس افسانے میں دلفگار کا کردار ایک غیر ملکی ہے جو اپنی محبوبہ کی شرط پوری کرنے کی غرض سے تین بار عازمِ سفر ہوتا ہے۔ دو بار وہ جزوی کامیابی سے لوٹتا ہے مگر معشوق کی شرط پوری کرنے لیے تیسری بار مایوسی کے عالم میں جب پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر اپنی جان گنوا دینا چاہتا ہے تو جنابِ خضر کی رہنمائی پر ہند کا سفر اختیار کرتا ہے جہاں وہ ایک میدانِ کارزار میں پہنچ جاتا ہے اور راجپوت جنگجو کو جانکنی کے عالم میں نیم جان پاتا ہے۔ یہ راجپوت حریت پسند جنگجو بیرونی حملہ آوروں کے خلاف لڑتے ہوئے وطن کی حفاظت میں شہید ہوتا ہے اور اس کے خون کا آخرہ قطرہ دلفگار دنیا کی سب سے انمول شے سمجھ کر اپنے پاس محفوظ کر کے مراد کا گوہر لیے واپس سرخرو لوٹتا ہے۔ یہ افسانہ حب الوطنی کے بیداری اور انگریز سامراج کے جبر کے خلاف ایک خاموش پیغام دیتا ہے جس کا اولین بیانیہ رومانی اور آخری حصے کا بیانیہ مقصدیت کا حامل ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"شام ہوتے ہوتے وہ ایک کفِ دست میدان میں پہونچا جہاں بے شمار نیم کشتہ اور بے جان لاشیں بے گور و کفن پڑی ہوئی تھیں۔ زاغ وزغن اور وحشی درندوں کی گرم بازی تھی اور سارا میدان خون سے شنگرف ہو رہا تھا۔ یہ ہیبت ناک نظارہ دیکھتے ہی دلفگار کا جی دہل گیا۔ خدایا! کس عذاب میں جان پھنسی۔ مرنے والوں کا کراہنا سسکنا، اور ایڑیاں رگڑ کر جان دینا، درندوں کا ہڈیوں کو نوچنا اور گوشت کے لوتھڑوں کو لے کر بھاگنا۔ ایسا ہولناک سین دلفگار نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ یکایک اسے خیال آیا۔ میدانِ کارزار ہے اور یہ لاشیں سُورما سپاہیوں کی ہیں۔ اتنے میں قریب سے کراہنے کی آواز آئی۔ دلفگار اس طرف پھرا تو دیکھا کہ ایک قوی ہیکل شخص جس کا مردانہ چہرہ ضعفِ جانکنی سے زرد ہو گیا ہے، زمین پر سرنگوں پڑا ہوا ہے۔ سینے سے خون کا فوارہ جاری ہے۔ مگر شمشیر آبدار کا قبضہ پنجے سے الگ نہیں ہوا۔ دلفگار نے ایک چیتھڑا لے کر دہانِ زخم پر رکھ دیا تاکہ خون رک جائے اور بولا۔ "اے جوان مرد تو کون ہے؟ جوانمرد نے یہ سن کر آنکھیں کھولیں اور دلیرانہ لہجے میں بولا۔ "کیا تو نہیں جانتا کہ میں کون ہوں؟ کیا تو نے آج اس تلوار کی کاٹ نہیں دیکھی؟ میں اپنی ماں کا بیٹا اور بھارت کا لختِ جگر ہوں۔ یہ کہتے کہتے اس کے تیوروں پر بل پڑ گئے زرد چہرہ خشمگیں ہو گیا اور شمشیر آبدار پھر اپنا جوہر دکھانے کے لیے چمک اٹھی۔ دلفگار سمجھ گیا کہ یہ اس وقت مجھے دشمن خیال کر رہا ہے۔ ملائمت سے بولا۔ "اے جوانمرد! میں تیرا دشمن نہیں ہوں۔ ایک آوارہ وطن غربت زدہ مسافر ہوں۔"(۲)

دلفگار اور جوانمرد کا مکالمہ گہری علامتیت کا حامل ہے۔ اس میں حب الوطنی سے سرشار راجپوت سپاہی کے لہو کو دنیا کا سب سے انمول رتن کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو دراصل ریاستی جبر و استبداد کے خاتمے کے لیے اپنے ملک و قوم کے لیے جان دے دیتا ہے۔

"سوزِ وطن" پریم چند کا باکمال افسانوی مجموعہ ہے جس کے شائع ہونے کے بعد انگریز سرکار نے اس میں بغاوت کے عنصر کو محسوس کیا اور ریاستی جبر کے تحت پابندی عائد کرتے ہوئے کاپیاں ضبط کر لی گئیں۔ پریم چند کا مطمعئ نظر وطن کی محبت کی شدّت تھا۔ اس ضمن میں وہ سرخرو نکلے۔ وطن سے محبت نو آبادیاتی عہد سے آزادی اور ریاستی جبر کے خلاف مزاحمت اور اظہار کی آزادی سے مملو ہے۔ یہ کہانی اپنے اسی مخصوص انداز کی وجہ سے اردو کے اولین افسانوں میں شام ہے۔ وطن کے لیے جذبۂ ایثار کے حوالے سے افسانے میں زخمی راجپوت سپاہی اور افسانے کے سربر آوردہ کردار دلفگار کے مابین ایک دلچسپ مکالمہ دیا گیا ہے حب الوطنی کے مصنفہ جمالیات سے معمور ہے۔ کارزار میں اپنے زخموں سے رسنے والے خون میں لت پت پڑا نیم جاں سپاہی دل فگار کو اپنے پہلو میں بٹھاتے ہوئے کہتا ہے:

"افسوس ہے تو یہاں وقت آیا جب ہم تیری مہمان نوازی کرنے کے قابل نہیں۔ ہمارے باپ دادا کا دیس آج ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس وقت ہم بے وطن ہیں۔ (مسکراؤ) اور گو کہ میں بے وطن ہوں مگر غنیمت ہے کہ حریف کے حلقہ میں مر رہا ہوں (سینے کے زخم سے چیتھڑا نکال کر) کیا تو نے یہ مرہم رکھ دیا۔ خون نکلنے دے۔ اسے روکنے کا فائدہ؟ کیا میں اپنے وطن میں غلامی کرنے کے لیے زندہ ہوں نہیں۔ ایسی زندگی سے مرنا اچھا ہے۔"(۳)

یہ مکالمہ جانبازی کی بھرپور علامت ہے کہ اس میں وہ تمام لزومات موجود ہیں جو فنِ مکالمہ نگاری کا تخصص ہیں۔ جذبۂ ایثار بھی ہے اور بغاوت بھی، حریت بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ریاستی جبر کے خلاف راجپوت کا ردِ عمل پوری شدت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔

کہانی کا کردار دلفگار جب اپنی معشوق کے پاس اس سپاہی کا آخری قطرۂ خوں لے کر جاتا ہے تو وہ ناز آفریں حجلۂ عروسی سے باہر آکر اس کا استقبال کرتی ہے اور اس کے قدموں میں بچھ جاتی ہے۔ مرصع صندوقچے سے ایک لوح نکالتی ہے جس پر لکھا ہوتا ہے کہ وطن کی حفاظت میں گرنے والا آخری قطرۂ خوں دنیا کی سب سے بیش قیمت شے ہے۔ یہ کہانی یہیں اختتام پذیر ہو جاتی ہے اور قاری کو ایک مسرت آگیں اور فرحت انگیز کم و کیف میں مبتلا کر دیتی ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ وطن کے ساتھ یہ دیوانہ وار محبت پریم چند کے افسانوں کی مقصدیت پسندیت کی دین ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر فردوس انور قاضی افسانے کے پلاٹ کے اس حصے پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"اس کہانی میں بھی والہانہ انداز میں وطن کی محبت دکھانے کی کوشش ہے اور ان اثرات سے نفرت کا اظہار ملتا ہے جو انگریزی حکومت کے تسلّط اور نتیجے میں ہندوستان کی زندگی پر مرتب ہوئے تھے۔"(۴)

"تسلط" ہمیشہ جبری ہوا کرتا ہے۔ انگریز سامراج نے برصغیر کے عوام کے گلے میں اپنی غلامی کا طوق ڈالا اور جبری قوانین کے ذریعے سے استعماریت کو مسلط کر دیا۔ کہانی کا انجام وطن کی محبت کے جذبے کو انتہا پسندی کی منزلوں تک لے جاتا ہے اور جو کہانی سچے جذبے اور حقیقت کی عکاسی سے شروع ہوتی ہے، اس میں بغاوت کی بُو باس کا ہونا لازمی امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جبر کی ہر شکل کے خلاف پریم چند کے افسانوی کرداروں میں باغیانہ روش ملتی ہے اور وہ ریاستی جبر و استبداد کے خلاف شدید نفسیاتی ردِ عمل کا اظہار کرتے ہیں۔

سوزِ وطن میں پریم چند نے جذبہ حب الوطنی کو اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔ ان افسانوں میں انگریز حکومت کی سیڈیشن نظر آتی ہے اس کی وجہ ہندوستانیوں میں حب الوطنی کا جذبہ براہ راست برطانوی حکومت کے مفاد سے ٹکراتا ہے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ عوام میں جذبہ حریت پیدا ہو اور وہ غلامی کی ان زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کریں جو زنجیریں انگریزوں نے ہندوستانیوں کو پہنائی تھیں۔ اس بارے میں سجاد ظہیر رقم طراز ہیں:

"برطانوی سامراجی نظریوں کی خصوصیت کیا تھی؟ اوّل تو تمام ہندوستانیوں کے ذہن میں یہ خیال پیدا کرنا کہ انگریز قوم ان سے ہر لحاظ سے بہتر ہے اور ہندوستان میں اس کی حکومت جائز اور مناسب ہے بلکہ خدا کی طرف سے نازل کی ہوئی ایک نعمت ہے۔ انگریزوں اور اُن کے وفادار رہنے پر ہندوستانی کا سیاسی اور مذہبی فرض قرار دیا گیا۔"(۵)

ریاستی جبر اور استحصال بالجبر کے حوالے سے پریم چند کے دیگر افسانوں میں "بھاڑے کا ٹٹو" اور "ستیہ گرہ" وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ پریم چند کے نقطہ نظر میں تبدیلی لانے والے عوامل میں سے انگریز سامراج کے ہندوستان کے لیے وضع کردہ قوانین اور قوانین کے تحت رونما ہونے والے واقعات ہیں۔ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں جلیانوالہ باغ کا واقعہ ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس واقعہ نے انگریزوں کی بربریت کے خلاف ہندوستانیوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اسی واقعہ کے ردِ عمل کے طور پر عدم تعاون کی تحریک نے زور پکڑا۔

پریم چند گاندھی جی کی عدم تشدد کی حکمت عملی کے خلاف ہو گئے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ استبدادی طاقتوں کے خلاف تشدد ایک ناگزیر حربہ ہے۔ روس کی ہم عصر تاریخ ان کے سامنے تھی۔ زارِ روس کے جبر و استبداد کو روسی انقلاب کے ذریعے ختم کیا گیا تھا۔ انقلابِ روس نے پریم چند کو فکری طور پر بہت متاثر کیا تھا۔ اسی دور میں انہوں نے ایسے افسانے لکھے جن میں زندگی کے واقعات کو سیاسی اثرات کے تحت پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پریم چند کی زندگی کے متعلق وسیع نقطہِ نظر اور گہرا شعور رکھتے تھے۔ ان کی حقیقت پسندی اور اظہار کی آزادی کا اس سے بڑا اعتراف اور کیا ہو گا کہ قدامت پسندوں سے لے کر ترقی پسندوں تک سبھی ان کے فن کی اہمیت و حیثیت کے قائل ہیں۔ پریم چند کے ہاں فنکار یا ادیب کا کام صرف زندگی کو پیش کرنا ہی نہیں بلکہ جہاں زندگی کی کمی ہو، وہاں اس کی تخلیق کرنا بھی ہے اور زندگی کو تخلیق کرنے کے مرحلے پر اسے کچھ نہ کچھ مثالیت پسند یا رومانی بننا پڑتا ہے۔ افسانہ اگر اپنے اندر اصلاح کا کوئی پہلو رکھتا ہے تو یہ اس کی خوبی ہے خامی نہیں۔ افسانہ نگار اپنے افسانوں میں اگر اپنے نظریے اور مقصد کو فنکارانہ انداز میں پیش کرتا ہے تو یہ اس کا حق ہے اور فرض بھی ہے۔

انگریز منظّم طور پر یہ کوشش کر رہے تھے کہ ہندوستانی اپنی تہذیب اور زبان کے مقابلے میں اپنے وطن کی عظیم تہذیب کو گھٹیا خیال کریں اور اس کی طرف سے بے توجہی برتیں۔ مغرب کی ہر ایک چیز کو سب سے بہتر سمجھیں۔ انگریزی فیشن اور آداب کی احمقانہ نقالی کریں۔ ان خیالات کے پیدا کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہمیں احساسِ پستی ہو اور ہندوستان ذہنی طور پر انگریز استعمار کا آلۂ کار اور مطیع بن جائیں۔ اس لیے انگریز مؤرخین نے انیسویں اور بیسویں صدی میں ہندوستان کی تاریخیں لکھیں، اُن میں یہی نظریہ پیش کیا گیا تھا، نو آبادیات کا خاصہ رہا اس قسم کی پابندیوں اور قدغنوں سے نہ تو آزادیٔ اظہار کو روکا جا سکا اور نہ ہی بیداری کی تحریک کو ختم کیا جا سکا۔ پریم چند کے ہاں آزادی کی تڑپ اس قدر شدید تھی کہ انہوں نے آزادیٔ اظہار کا استعمال کیا اور جس قدر رکاوٹیں بڑھتی جاتی تھیں، اُسی قدر اُن کا فن اور نقطہ واضح اور بھرپور ہوتا جاتا تھا۔ یہ کمال اسی افسانہ نگار کو نصیب ہوا ہے کہ اُن کی پہلی کتاب کو انگریز حکومت نے اپنے لیے مضر

سمجھا اور اس کی ضبطی کے احکام صادر کئے لیکن ریاستی جبر کے یہ ہتھکنڈے پریم چند کے لئے مہمیز ثابت ہوئے۔ انہوں نے سیاسی تصورات کو بدلنے کے لیے ایک ایسی جدوجہد کا عملی آغاز کیا جس کے بغیر نو آبادیاتی اقتدار سے آزادی کا حصول بھی لایعنی ہو گیا۔ لہٰذا مزاحمت پریم چند کے باطنی رویے کے طور پر متشکل ہوئی جسے اظہاری صورت افسانوں میں ملی۔ یہی وجہ ہے کہ حکومتی جبر و استبداد کے باوجود پریم چند نے علامتی سطح پر ریاستی جبر کے خلاف مزاحمت جاری رکھی۔ "بھاڑے کا ٹٹو" میں رمیش کا کردار مزاحمتی تناظر میں گہری علامتیت کا حامل ہے۔ رمیش کا ہم جماعت دوست جسونت کا کردار ہندوستان میں اس مفاد پرست طبقے کا نمائندہ ہے جس نے دولت کی خاطر اپنوں کا خون بیچا اور ملک و قوم کے ساتھ غداری کی۔ جبکہ رمیش بائیں بازو کے حریت پسند طبقے کا علامتی کردار ہے جو جبر و استحصال کی ہر شکل کے خلاف سینہ سپر ہو جاتا ہے۔ اس افسانے میں ریاستی جبر کی علامتی جزئیات کے ساتھ افسانہ نگار نے بہ تمام و کمال عکاسی کی ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "ملک کی سیاسی حالت نازک ہو رہی تھی۔ خفیہ پولیس نے ایک طوفان کھڑا کر دیا تھا۔ اس کی فرضی داستانیں سن سن کر حکام کی روح فنا ہو رہی تھی۔ کہیں اخباروں کا منہ بند کیا جاتا تھا۔ کہیں لیڈروں کا۔ خفیہ پولیس نے اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے حکام کے اس طرح کان بھرے کہ انہیں ہر ایک آزاد خیال شخص خونی اور قاتل نظر آتا تھا۔ رمیش یہ اندھیر ادیکھ کر خاموش بیٹھنے والا انسان نہ تھا۔ جوں جوں حکام کی خود بڑھتی جاتی تھی۔ اسی نسبت سے اس کے جوش میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ روز کہیں نہ کہیں لیکچر دیتا اور عموماً اس کے سارے لیکچر باغیانہ جذبات سے مملو ہوتے تھے۔ صاف اور کھری بات کہنا ہی بغاوت ہے۔
>
> اگر کسی کا لیکچر باغیانہ نہیں سمجھا گیا تو سمجھ لو کہ اس نے اپنے اندرونی جذبات کو چھپا رکھا ہے۔ اس کے دل میں جو کچھ ہے اسے زبان پر لانے کی ہمت اس میں نہیں ہے۔ رمیش نے دلی جذبات کو مخفی رکھنا سیکھا ہی نہ تھا۔ رعایا کا لیڈر بن کر جیل اور پھانسی سے ڈرنا کیا؟ جو آفت آنی ہو آوے۔ وہ سب کچھ سہنے کو تیار بیٹھا تھا۔ حکام کی نظروں میں وہی سب سے زیادہ کھٹک رہا تھا۔"(۶)

برطانوی سامراج جنگِ عظیم اول کے بعد برصغیر میں اپنے اقتدار کو طول دینے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ اس لیے 1919ء کے بعد ہندوستان میں جبری قوانین کے نفاذ میں زیادہ تیزی آگئی۔ بہت سے ناخوش گوار واقعات رونما ہوئے۔ سودیشی تحریک چلی اور کچھ مزاحمت پسندوں نے برطانوی سامراج کے جبر کے خلاف عسکری جدوجہد بھی شروع کر دی۔ خصوصاً بائیں بازو کے جو عسکری گروہ تھے، انہوں نے حکومت کو گرانے کے لیے امرا و حکام کو لوٹنا بھی شروع کیا۔ روس میں بولشویک انقلاب اور زارِ روس کے انہدام کے بعد ہندوستان میں آزادی کے لیے جدہ جہد کرنے والوں کو مزید تقویت ملی۔ اس صورتِ حالات کا اظہار پریم چند نے اس افسانے میں رمیش کے ذریعے سے کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

"تمام دن کی سخت محنت کے بعد وہ غریبوں کی فلاح اور اصلاح کے منصوبے باندھا کرتا تھا۔ سوچتا کہ انسان کیوں گناہ کرتا ہے۔ اس لیے نا کہ دنیا میں اس قدر افتراق ہے؟ کوئی تو عالیشان محلوں میں رہتا ہے اور کسی کو درخت کا سایہ بھی میسر نہیں۔ کوئی ریشم و جواہرات سے منڈھا ہوا ہے، کسی کو پھٹا کپڑا بھی نصیب نہیں۔ ایسی بے انصاف دنیا میں اگر چوری، ہتھیا اور ادھرم ہے تو یہ کس کا قصور ہے؟ وہ ایک ایسی انجمن قائم کرنے کا خواب دیکھتا تھا جس کا کام دنیا سے افتراق کو ناپید کرنا ہو۔ دولت مند اگر اپنی دولت خوشی سے نہیں بانٹ دیتا تو اس کی مرضی کے خلاف تقسیم کر لینے میں کیا گناہ؟ دولت مند اسے گناہ کہتا ہے تو کہے۔ اس کا بنایا ہوا قانون اگر سزا دینا چاہتا ہے تو دے۔ ہماری عدالت بھی علیحدہ ہو گی۔ اس کے سامنے وہ سبھی ملزم ہوں گے جن کے پاس ضرورت سے زیادہ راحت کے سامان ہیں۔ ہم انہیں سزا دیں گے۔ ہم بھی ان سے سخت محنت لیں گے۔ جیل سے نکلتے ہی اس نے جماعتی انقلاب کا اعلان کر دیا۔"(۷)

مزاحمت کا یہ رویہ تشدد اختیار کر چکا تھا اور 1925ء کے بعد برصغیر کے حالات بڑی تیزی کے ساتھ تبدیل ہونے لگے۔ یہ دور ریاستی جبر کے خلاف خفیہ ردِ عمل کا دور ہے۔ اور اس ردِ عمل میں زیادہ تر کانگریس، سکھ اور مسلم لیگ کے لوگ شامل تھے جو سیاسی سطح پر ردِ عمل کی مہم کا حصہ تھے جبکہ راجاؤں اور مہاراجاؤں کی نظریں انگریز بہادر کی قربت کے حصول پر مرتکز تھیں کیونکہ خاندانی راجواڑے ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے۔ اہلِ قلم میں سے صرف وہی لوگ ریاستی جبر کے خلاف لکھ رہے تھے جو ہر قسم کے ریاستی جبر و استبداد سہنے کو تیار بیٹھے تھے۔ پریم چند نے متذکرہ بالا افسانے میں رمیش کے کردار کے ذریعے ادبا کے اس طبقے کی طرف اشارہ کیا ہے جو ظلم و جبر کے خلاف بے لاگ تبصرہ رقم کیا کرتے تھے اور ہر انجام بھگتنے کے لیے تیار تھے۔ استحصال بالجبر کے خلاف یہی کردار بعد میں مسلح جدوجہد کرتا ہے جو برصغیر کی آزادی کے لیے مسلح جدوجہد کرنے والوں کی طرف اشارہ ہے۔

پریم چند کے اس قبیل کے دیگر افسانوں میں "ستیہ گرہ" ایک اہم افسانہ ہے جس میں مفاد پرست مذہبی پیشواؤں کے کرپٹ طبقے کے منحوس باطن کو دکھایا گیا ہے جو چند سکوں کی خاطر انگریز کے ہاتھوں بک جاتے تھے اور دوسری طرف ریاستی جبر کے خلاف کانگریسی رہنماؤں کا ردِ عمل ہڑتالوں اور بائیکاٹ کی صورت میں بیان کیا گیا ہے:

"ادھر کانگریس نے شہر میں ہڑتال کرنے کی منادی کر دی تھی جس سے اہلکاروں میں بڑی ہلچل تھی۔ ایک طرف سڑکوں پر جھنڈیاں لگائی جا رہی تھیں۔ صفائی ہو رہی تھی۔ پنڈال بن رہا تھا اور دوسری طرف فوج و پولیس کے سپاہی سنگینیں چڑھائے شہر کی گلیوں اور سڑکوں پر قواعد کرتے پھرتے تھے۔ حکام کی سر توڑ کوشش تھی کہ ہڑتال نہ ہونے پائے مگر کانگریس والوں کو دُھن تھی کہ ہڑتال ہو اور ضرور ہو۔ اگر حکام کو حیوانی طاقت پر ناز ہے تو ہمیں روحانی طاقت پر بھروسہ ہے۔ اس بار دونوں کی آزمائش ہو جائے کہ میدان کس کے ہاتھ رہتا ہے۔"(۸)

ایک بڑے افسانہ نگار کا بنیادی تخصص حوادث کو مناظری جزئیات کی حرکی و سبک جمالیات کے ساتھ زیست آثار بنانا ہوتا ہے تاکہ منظر منظر جاودانی کا جادو جاگے۔ پریم چند کی خوش قسمتی ہے کہ اس کے افسانوں میں ریاستی جبر کا بیانیہ ہو یا اس کے ردِ عمل کا اظہاریہ ہو، کہیں بھی کوئی جھول اور گرانی محسوس نہیں ہوتی۔

عوام کی خوشحالی، سیاسی بیداری، حبّ الوطنی کے تاثرات کو عام کرنے اور انگریزی سامراج کے جبر کے سامنے پریم چند کی خدمات اردو کے مزاحمتی رجحانات کا روشن بیانیہ ہیں۔ جن کی گواہی ان کے افسانوں میں موجود ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ سہراب اسلم، "منشی پریم چند اور اردو فکشن"، مشمولہ ماہنامہ عوامی منشور، مدیر اعلیٰ طفیل عباس، شمارہ نمبر ۴، جلد نمبر ۲۱، ماہِ جولائی ۲۰۰۷ء، ص ۳۰

۲۔ پریم چند، "دنیا کا انمول رتن"، مشمولہ: سوزِ وطن، زمانہ پریس کانپور، طبع اول، جون ۱۹۰۸ء، ص ۲۲

۳۔ ایضاً، ص ۵۲

۴۔ فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، "اردو افسانہ نگاری کے رجحانات"، مکتبہ عالیہ لاہور، بارِ دوم، ۱۹۹۹ء، ص ۱۰۹

۵۔ سجاد ظہیر، "روشنائی"، مکتبہ دانیال کراچی، بارِ دوم، جنوری ۱۹۸۶ء، ص ۴۵

۶۔ پریم چند، "پریم چند کے بے مثال افسانے"، الحمد پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۳۵

۷۔ ایضاً، ص ۲۵۷

۸۔ ایضاً، ص ۱۴۹

☆☆☆☆☆